

## مقالات

## اسلامی قانون معیشت

## اسکی روح اور اسکے اصول

(۲)

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی)

ماخوذ از حجتہ اللہ البالغہ ابواب استغفار الرزق

چند اصولی پابندیاں | مذکورہ بالا حدود کے علاوہ چند اصولی پابندیاں اور ہیں جو تجارتی معاملات پر عائد کی گئی ہیں

آگے بڑھنے سے پہلے ایک سرسری نگاہ ان پر بھی ڈال لینی چاہیے:

ناجائز شرطیں باطل ہیں | بیع مشروط کے متعلق بعض مخصوص احکام اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں ایک عام اور اصولی بات

بیان کر دی جاتی ہے۔ شائع کا فرمان ہے کہ ”ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، باطل ہے“ لیکن اس کا مدعا یہ

ہنیں ہے کہ ہر وہ شرط جس کی قرآن میں صریح اور منصوص اجازت موجود نہیں ہے، باطل ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ شرط

قرآن میں تصریحاً ممنوع قرار دے دی گئی ہے یا جو روح قانون اسلامی کے مخالف ہو، وہ شرط باطل اور ناجائز ہے۔

حقوق ولایت کی بیع ناجائز ہے | حقوق ولایت کا بیعنا اور عہد کرنا اسلام میں قانوناً ناجائز ہے۔ کیونکہ قابل خرید و فروخت

صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو حسی اور مشاہدہ ہو۔ ولایت کے حقوق کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ وہ تو ایک ذہنی اور اضافی

چیز ہے۔ نیز ولایت نسب کے تابع ہے۔ جس طرح نسب کی بیع اور عہد جائز نہیں اسی طرح ولایت کی بیع اور اس کا عہد

بھی جائز نہیں۔

لین دین جس قسم کھانے کی ممانعت | تجھرتی کاروبار میں بات بات پر قسم کھانا ایک عام شیوہ سا ہو گیا ہے۔ یہ ایک نہایت ذلیل حرکت ہے۔ اس میں برائی کے دو پہلو ہیں، ایک تو فریق ثنائی کو اس کے ذریعہ دعو کا دیا جاتا ہے اور دوسرے اللہ کا نام ایک کھیل بن جاتا ہے اور اس کی حقیقی عظمت کا احساس تک لوں سے فنا ہو جاتا ہے۔ اس لیے شارع نے فرمایا ہے کہ الحلف منفقۃ للسلعۃ محققة للبرکۃ و تجارت میں قسم کھانا اگر مال کی نکاسی کا ذریعہ ہے تو کمائی میں بے برکتی کا بھی ذریعہ ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اسلام اپنے پیروں میں اس مذموم رسم اور عادت کا کوئی ہلکا سا اثر بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے کہ وہ اسے تجارت پیشہ لوگوں فرید و فروخت کرتے وقت زبان سے بہت سی فضول باتیں اور ناروا قسمیں نکل جایا کرتی ہیں اس لیے بیع کے ساتھ کچھ صدقہ بھی دیا کرو۔ صدقہ کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ وہ ان فضول گوئیوں اور غلطیوں کا کفارہ ہو جائے۔

سونے اور چاندی کے سکوں کا مبادلہ | اگر کوئی شخص اپنی چیز کو دینار (سونے کے سکے) کے حساب سے بیچتا ہے لیکن دینار کے بجائے درہم دچاندی کے سکے، لیتا ہے تو قانون اسلام اسے اس کی اجازت دیتا ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک تو یہ کہ درہم کی قیمت وہی مانی جائے جو اس روز بازار میں تھی۔ دوسری یہ کہ فریقین معاملہ اسی وقت چلتا کریں، یعنی جدا ہونے سے پہلے ان کے درمیان کوئی بات تصفیہ طلب نہ رہ گئی ہو۔ مثلاً اس امر کا تصفیہ کہ کتنے دیناروں کے قائم مقام کتنے درہم ہونگے، امر انوں پر چھوڑ دیا گیا ہو یا اسی قسم کی کوئی اور چیز زمانہ مستقبل میں طے ہونے کے لیے اٹھار کھی گئی ہو۔ اگر ان شرطوں کو پورا نہ کیا جائے تو بائع کو اس کی اجازت نہیں کہ دینار کے بجائے قیمت میں درہم لے کیونکہ یہ صورت نزاع پیدا کرنے کا احتمال رکھتی ہے اور اس سے معاملہ صاف اور یکسو نہیں ہونے پاتا۔

ناپ تول میں کمی کی ممانعت | ناپ تول میں ڈنڈی مارنے کی سخت ممانعت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم دو ایسی چیزوں (ناپ تول اور تولی) کے مختار اور ذمہ دار بنائے گئے ہو

جن کے ذریعہ بہت سی پھٹی تو میں ہلاک ہو گئیں۔“ یعنی ناپے تو لےنے میں صل اور قسط کا پورا پورا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے کتنی ہی تو میں ہلاک ہو چکی ہیں مثلاً قومِ شعیب، جس کا عبرتناک حشر قرآن میں لکھا ہوا موجود ہے۔ پس ہر مسلمان کو اس خیانت اور بد معاملگی سے بچنا چاہیے۔

نرخوں کا حکم مقرر کیا جانا | تجارتی کاروبار میں ایک سوال حکومت کے اختیارات کا آتا ہے کہ آیا وہ اشیاء کی قیمت

کا جبری تعین کر سکتی ہے جس کے مطابق بیچنے پر اہل تجارت مجبور ہوں؟ اسلامی قانون تجارت کا رجحان اس طرف ہے کہ تجارت اس معاملہ میں آزاد ہیں۔ حکومت کو ان کی آزادی میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک بار لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ تاجروں نے چیزوں کا بھلا بہت چڑھا دیا ہے، آپ ان کی قیمتوں کا مناسب تعین فرمادیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ”قیمتوں کا مقرر کرنا اور روزی کا گھٹانا بڑھانا اللہ کے اختیار میں ہے، میں نہیں پسند کرتا کہ میں خدا سے اس حال میں ملوں کہ کسی پر ظلم کرنے کا بار میری گردن پر ہو اور وہ اس کے حضور داد رسی کرے۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا عادلانہ نرخ معین کرنا جو تاجر اور خریدار دونوں کے نفع نقصان کے لحاظ سے بالکل ٹھیک ہو حتیٰ کہ کسی کی ایک ذرہ برابر حق تلفی نہ ہو، تقریباً ناممکن ہے، اسی لیے آنحضرت صلعم نے اس کے لیے کوئی حکم صادر کرنے سے اجتناب فرمایا تاکہ آئندہ چل کر امر اور حکام اس حکم کو اپنے لیے سند نہ بنالیں اور اس کی آڑ میں جب چاہیں اور جس قدر چاہیں چیزوں کی قیمت گھٹا بڑھا دیں۔ تاہم اگر کھلم کھلا تجارت پیشہ لوگ لوٹ ہی پڑا تر آئیں اور چیزوں کو بہت گرا کر کے لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیں تو حکومت کے لیے جائز ہے کہ رفاہ عام اور مصالح تمدن کے پیش نظر انہیں اس خود غرضانہ لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ کر چیزوں کی قیمتیں متعین کر دے۔

احکام بیع | اب تک جو اصول ہم نے بیان کیے ہیں ان کا تعلق اسلامی قانون تجارت کے سببی پہلو سے

تھا۔ یعنی یہ کہ تلاش معاش کی جدوجہد میں لوگوں کو کن کن تجارتی طریقوں سے بچنا چاہیے۔ اب ہم اس قانون کے اثباتی پہلو پر ایک اجمالی گفتگو کر کے بتائیں گے کہ شارع علیہ السلام نے مختلف موقعوں پر تجارتی معاملات

میں کیا ہدایات فرمائی ہیں۔

(۱) اگر کوئی شخص درخت خریدے اور اس پر پھل بھی لگے ہوئے ہوں تو وہ پھل بیع میں شامل نہ سمجھے جائیگا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ اگر کوئی شخص کھجور کا درخت خریدے تو اس پر لگی ہوئی کھجوریں معاملہ بیع میں شامل نہ ہونگی بلکہ وہ بیچنے والے کی ملک مافی جائینگے، الایہ کہ درخت خریدتے وقت اس نے ان کھجوروں کو بھی معاملہ بیع میں محسوب کرنے کی تصریح کر دی ہوگی۔ کیونکہ اصلاً معاملہ تو اس درخت کا ہو رہا ہے اور یہ پھل اس سے ایک زائد چیز ہے جو خریدار کی ملک میں آنے سے پہلے درخت پر لگی تھی، لہذا اس کی حیثیت اس مال و اسباب کی سی ہے جو کسی گھر کے صحن میں پڑا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ صحن یا گھر کی خرید و فروخت کا اثر اس مال پر کچھ نہیں پڑ سکتا۔

اس سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ اصل کی بیع میں فرع شامل نہ ہوگی جب تک کہ فرع کے متعلق معاملہ میں تصریح نہ ہو۔

(۲) اگر کوئی شخص کسی چیز کو خریدتا ہے اور کچھ روز کے بعد اس کے کسی عیب پر مطلع ہو کر واپس کر دیتا ہے تو اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مدت میں جو نفع اس نے اس چیز سے اٹھایا ہے، مثلاً اگر مکان تھا تو اس کا کرایہ وصول کیا ہے، اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہونا چاہیے۔ آیا اس چیز کے ساتھ وہ نفع بھی اصل مالک کو لوٹانا چاہیے یا نہیں؟ اسلام نے اس باب میں یہ اصول مقرر کیا ہے کہ الخواجح بالفضان (یعنی نفع اسی کا ہے جو نقصان کا ذمہ دار ہو) اس قاعدہ کی رو سے نفع کا مستحق خریدار ہے کیونکہ وہ اس چیز کا اس مدت میں صاف رہا ہے۔ اگر وہ چیز اس قبضہ کے زمانہ میں ضائع ہو گئی ہوتی تو وہی نقصان اٹھاتا، لہذا جب اس کے نقصان رساں پہلو کا ذمہ دار ہے تو منفعت بخش پہلو بھی اسی کے حق میں ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں اگر بائع کو اس نفع کا حق دار ٹھہرایا جائے تو فریقین کے درمیان نفع کی کمی در زیادتی پر جھگڑا پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے لہذا قطع نزاع کے لیے بھی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس حق کا حقدار خریدار ہی کو قرار دیا جائے۔

اس میں اصولی بات یہ ہے کہ "نفع کا تعلق ہمیشہ نقصان کی ذمہ داری کے ساتھ رہے گا۔" (۳) دو اگر فریقین (بائع اور مشتری) میں باہم کسی بات پر اختلاف پیدا ہو جائے اور شے فروختی وقت تم اور اپنی اصلی حالت پر موجود ہو اور کسی فریق کے پاس اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہ ہو تو ایسی صورت میں بائع کی بات مانی جائیگی الا آنکہ دونوں کسی نقطہ پر مجتمع ہو جائیں۔ یہ شارع کا مقرر کیا ہوا اصول ہے۔ جس کے ذریعے اس نے جھگڑے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس قاعدہ کی بنا اس پر ہے کہ "کوئی چیز اپنے مالک کے قبضہ سے صرف اسی صورت میں نکل سکتی ہے جب کہ فریقین کی باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ بیع طے ہو جائے۔" اب چونکہ یہاں یہ صورت حال نہیں پائی گئی اور رضا کے بجائے آپس میں اختلاف رونما ہو چکا ہے اس لیے معاملہ کو ختم سمجھ کر مندرجہ بالا اصل کی طرف رجوع کرنا ضروری ٹھہرا یعنی وہ چیز بائع کی سمجھی جائیگی اور اس کی قیمت وہی مانی جائیگی جو بائع کہتا ہے۔ ہاں خریدار کو البتہ یہ اختیار ہے کہ اس قیمت پر چاہے چیز لے یا نہ لے۔ کیونکہ معاملہ بیع کے انعقاد کے لیے جس طرح فریق اول (بائع) کی رضا شرط ہے اسی طرح فریق ثانی (خریدار) کی بھی شرط ہے۔

(۴) اگر کوئی شخص بیع سلم کے طور پر کوئی چیز خریدے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس چیز کی مقدار اور قبضہ کرنے کے وقت کی تعیین کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو لوگوں میں اس طرح کی بیع کا بڑا رواج تھا۔ لوگ روپیہ پیشگی دیدیتے اور دو دو تین تین سال بعد پیدا ہونے والے پھلوں کو خرید لیتے اپنے اسے بالکل منوع تو نہیں کیا البتہ اتنی شرط لگادی کہ اس چیز کی مقدار یا وزن متعین ہو۔ نیز یہ صاف صاف طے ہو جائے کہ بائع کس وقت خریدار کو وہ چیز دے گا۔

(۵) قرض کے بین دین میں تحریری دستاویز اور شہادت کی سخت تاکید ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَعْتُمْ  
لے ایمان لانے والو جب تم کسی مدت میں تک  
بِدَّيْنٍ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسَمًّىٰ فَاكْتُبُوهُ ۗ  
کے لیے ایک دوسرے سے قرض لو تو اسے لکھ لیا کرو۔

قرض کا معاملہ معاشی امور میں گونا گوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک طرف معاشی ضروریات کے پیش نظر قرض کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، دوسری طرف یہ دیگر معاملات کی بہ نسبت بہت زیادہ نزاع آفریں اور خصوصیت انگیز ہے۔ اسی اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ قرض کے معاملات پر گواہ بنانے اور انہیں ضبط تحریر میں لانے کی سخت تاکید فرمائی ہے اور کتمان شہادت کی سخت ممانعت کر دی ہے۔ پھر اسی ضمن میں نیز انہیں معاشی ضرورتوں کے باعث رهن اور كفالة وغیرہ معاملات کی بھی اجازت دے دی ہے۔

مضاربت یا شرکت کے معاملات | اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ نسل انسانی منی الطبع واقع ہوئی ہے اور اس کا معاشی سوال اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے افراد میں باہم تعاون نہ موجود ہو۔ چنانچہ تاریخ تمدن بتلاتی ہے کہ یہ معاشی تعاون مختلف شکلوں میں قوموں کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اس تعاون اور اشتراک کی مندرجہ ذیل قسمیں ہو سکتی ہیں:

(۱) دو آدمی کوئی تجارتی کاروبار اس طرح پر شروع کریں کہ ایک کا سرمایہ ہو اور دوسرے کی محنت اور منافع حسب معاہدہ دونوں تقسیم کر لیں۔ اسے اصطلاح میں ”مضاربت“ کہتے ہیں۔

(۲) دو آدمی مل کر اس طرح تجارت کریں کہ سرمایہ میں دونوں برابر کے شریک ہوں، ہر ایک جو کچھ بھی یا خریدے دوسرا بھی اس میں شریک ہو، حتیٰ کہ دونوں ایک دوسرے کے ضامن اور ایک دوسرے کے فنانس عام ہوں اور بیوپار میں جو نفع ہو اسے دونوں آپس میں بھٹے مساوی تقسیم کر لیں۔ اس کا نام ”شرکت معاوضہ“ ہے۔

(۳) دو آدمی کسی مہین سرمایہ سے تجارت کریں جس میں دونوں کے حصے برابر ہوں اور ہر ایک اس سرمایہ کی مدت تک خرید و فروخت میں دوسرے کا قائم مقام ہو۔ لیکن ایک دوسرے کا ضامن یا ور کھیل قائم نہ ہو کہ محض شریک کار ہوں کی وجہ سے جو کچھ ایک پر بار ہو وہ دوسرے سے طلب کیا جاسکے۔ اسے ”شرکت عنان“ کہتے ہیں۔

(۴) دو آدمی اس طرح تجارت شروع کریں کہ سرمایہ کسی ایک کا بھی نہ ہو بلکہ ہر ایک محض اپنی ذاتی شخصیت سے کام لیکر بانٹار سے ادھار مال حاصل کرے اور دونوں مل کر اسے بچیں اور قرض ادا کرنے کے بعد نفع باہم تقسیم کر لیں اس کا نام اصطلاح شرع میں "شُرکت وجوہ" ہے۔

(۵) ایک شخص اپنے لیے نہیں بلکہ کسی دوسرے کے لیے معاملات کرے۔ اسے "وکالت" کہتے ہیں۔

(۶) دو صنعت پیشہ آدمی مل کر کام کریں اور جو کچھ حاصل ہو آپس میں بانٹ لیں۔ یہ "شُرکت عمل" ہے۔

(۷) ایک شخص باغ کی دیکھ بھال اور آبپاشی دوسرا آدمی کرے اور اس باغ سے جو پھل پیدا ہوں وہ ان میں سے حصہ بٹائے۔ اسے آئین اسلامی میں "مساقاۃ" کہتے ہیں۔

(۸) زمین اور بیج ایک آدمی کا ہو اور ہل بیل تیز کاشت کرنے کی جملہ محنت دوسرے آدمی کی۔ اس طرح

جو غلہ پیدا ہو اس میں دونوں شریک ہوں۔ اس کا نام "مزارعت" ہے۔

(۹) ایک شخص کی محض زمین ہو اور بیج، ہل اور بیل اور محنت سب دوسرے کی ہو۔ اسے "مخایرہ" کہتے ہیں

اور یہ دراصل مزارعت ہی کی ایک قسم ہے۔

(۱۰) مزارعت ہی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ زمین، بیج اور ہل اور بیل سب کچھ ایک ہی آدمی کا ہو اور دوسرے

کی صرف محنت ہو۔

معاشی تعاون اور شریک عمل کی یہ تمام صورتیں اور اسی نوعیت کی دوسری صورتیں بھی اسلام میں جائز

ہیں، اور آج کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ فریقین میں جو شرائط طے ہو جائیں انکی پوری پابندی کی جائے، بجز ایسے

معاہدہ اور ایسی شرائط کے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے والی ہوں۔

معاملات میں فضل اور فیاضی | یہاں تک جو اصولی قوانین بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق معاشی معاملات میں خود عرضی، ظلم و عدوان

اور نزاع کی روک تھام سے تھا۔ لیکن اسلام نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے معاشی معاملات میں

فصل، فراخ دلی، فیاضی، ایثار اور امداد یا ہی کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور احسان و تبرع کو بھی معاشی





اسی احسان اور تبرع کی تعلیم دیتے ہوئے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ ”اگر کوئی خریدار قیمت ادا کرنے سے پیشتر مفلس ہو جائے اور قیمت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو بائع کو چاہیے کہ اپنی چیز کو واپس لے لے اور اسے قیمت ادا کرنے پر مجبور نہ کرے“ اسی طرح آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ”اگر قرض دار تنگ دست ہو جائے تو قرض خواہ کو اپنا قرض معاف کر دینا چاہیے یا کم از کم مطالبہ میں نرمی برتے اور اسے ادا کرنے کی کافی مہلت دے اللہ تعالیٰ اس کو روز جزا کے احوال سے محفوظ رکھے گا“

اس کے برعکس اگر قرض دار قرض ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور پھر قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہو دوسروں کو چاہیے کہ اس پر دباؤ ڈال کر حساب بے باق کرائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ”توانگر کا ادائیگی قرض میں لیت و عمل کرنا ظلم و نا انصافی ہے۔ ہاں اگر قرض دار کسی دوسرے شخص کا حوالہ دے تو اس کا حوالہ قبول کر لینا چاہیے“ اس دوسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اگر قرض دار کا دوسرا پیسہ کسی دوسرے پر آتا ہو اور وہ قرض خواہ سے کہے کہ تم اس سے وصول کر لو، تو ایسی صورت میں قرض خواہ کو یہ اصرار نہ کرنا چاہیے کہ میں تو تجھی سے وصول کروں گا۔

اسی تبرع کی خاطر قرآن نے مسلمانوں کو بار بار صدقات پر ابھارا ہے اور حکم دیا ہے کہ جو مال اللہ نے انھیں دیا ہے اس میں سے اپنے غریب اور نادار بھائیوں پر بھی خرچ کریں، اور اس کے عوض رضائے الہی کے ماسوا کوئی معاوضہ ان کے پیش نظر نہ ہو۔ پھر ایک ایک چیز کو گنا کر بتا دیا کہ ان صدقات کو ان کے صحیح مصارف میں خرچ کرنا فروری ہے۔ وہ مصارف یہ ہیں:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَاللَّسَّائِنِ  
وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلُوفَةِ قُلُوبُهُمْ  
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ  
اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ الخ۔ (توبہ - ۸)

صدقات تو محض فقیروں، مسکینوں، محبیلین کو ادا  
کمزور ایمان والے نو مسلموں (جن کی تالیف قلب  
کی ضرورت ہو) اور غلاموں، قرضداروں، راہِ خدا  
میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے ہیں۔

لیکن صدقات کے ذریعہ سے عرف غریب اور حاجت مندوں ہی کے ساتھ احسان اور مواساة کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ کھاتے پیتے مسلمانوں کے ساتھ اظہار اخوت و مواساة کا ذریعہ وہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے شارع نے ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کی تلقین کر کے ہر امیر اور غریب کے ساتھ رشتہ اخوت و مودت کو مضبوط کرنے کی ترغیب دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تھا دو ا فان الہدیۃ تذهب الضغائن (ایک دوسرے کے یہاں ہدینے بھجوانا کیونکہ ہدیہ دلوں کو کینوں سے صاف کرتا ہے) اور یہ ایک امر واقعہ ہے۔ ہدیہ خواہ کتنا ہی قلیل اور ادنیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو لیکن وہ اس بات کی علامت ہے کہ ہدیہ بھیجنے والا اپنے دل میں اسکی جگہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر شارع نے ہدیہ واپس کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق یہ ہے کہ صدقہ محض لوجہ اللہ ہوتا ہے اور ہدیہ دیکر اس شخص کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ چیز بھی انسانیت اور مصالح تمدن دونوں کے لیے اکیس حیات کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے سوسائٹی کے افراد میں الفت اور اتحاد کی ذبردست اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ جس شخص کے پاس ہدیہ آئے، اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو چاہیے کہ وہ بھی اس کو جو دے اور اگر استطاعت نہیں رکھتا تو ہدیہ دینے والے کے حق میں خیر و تحسین کے کلمات کہے۔ ایسا کرنا گویا اس کی ہمدردی کا شکر یہ ادا کرنا ہو جائیگا۔ لیکن جس نے یہ بھی نہ کیا اس نے سخت ناشکری کی۔ اور جس نے ہدیہ دینے میں اپنی حیثیت سے بہت بڑھ چڑھ کر نمائش کی اسکی مثال اس ریاکار زندگی سی ہے جس نے سر سے پیر تک خرقہ زبا و پہن رکھا ہو۔“

ہدیہ کے جواب میں ہدیہ بھیجنے میں ایک تو یہ مصلحت ہے کہ اس طرح دونوں جانب سے قربت و الفت کی پیش کش ہوگی جو ہدیہ کا مقصد و حید ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اوپر کا ہاتھ ہر حال نیچے کے ہاتھ سے افضل ہے اس لیے انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا ہاتھ نیچا نہ رہ جائے۔ لیکن اگر واقعی وہ اسکی قدرت نہیں رکھتا تو کم

سے کم اسے اچھے کلمات سے یاد ہی کرے کہ یہ چیز بھی انجام کے لحاظ سے ہدیہ دینے کے برابر ہی ہے۔ لیکن اچھے کلمات یاد کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ بھدیتی کرنا اور تعریفوں کے پل بانڈھنا شروع کر دے۔ اس کا مقصد طریقہ بھی شریعت نے متعین فرما دیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص شخص پر کوئی احسان کیا گیا ہو اور وہ اپنے عن کو جزاک اللہ خیر کہہ دے تو اس نے تمہیں دینا کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کر دیا۔ شریعت کا مقرر کیا ہوا یہ طریقہ اظہار شکر اسلامی نقطہ نظر سے اپنے اندر انتہائی مناسبت، جامعیت اور اعتدال رکھتا ہے اس پر اضافہ کرنا جس طرح تعلق اور دناست کی دلیل ہے اسی طرح اس میں بھی نخل کرنا انتہائی بد اخلاقی اور کفران نعمت ہے۔

ہدیہ دے کر واپس لے لینا نہایت ہی ذلیل اور مکروہ حرکت ہے۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ کسی چیز کو حصہ کر کے پھر اسے واپس لے لینے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے جو قے کر کے اسے چاٹے، ہم (مسلمانوں) کو ایسی بری حرکت زیب نہیں دیتی، غور کرو یہ مثال کس قدر بنی بر حقیقت ہے۔ جب ایک شخص اپنی مرضی سے اپنے مال کا ایک حصہ کسی کو عہدہ کر دیتا ہے اور پھر اسے لوٹانا چاہتا ہے، تو آخر کونسی چیز سے اس فعل پر آمادہ کر رہی ہے؟ ظاہر ہے یا تو وہ انتہائی تنگ دل اور خسیس ہوگا اور کسی اتفاقی جذبہ سے متاثر ہو کر ایک چیز عہدہ کرنے کے بعد اسے اپنی حرکت پر افسوس آیا ہوگا اور اب اسے واپس مانگ رہا ہے، یا اس شخص کو، جسے اس نے عہدہ کیا تھا، تنگ کرنا اور اسے نقصان پہنچانا مقصود ہوگا۔ ان دونوں وجوہ میں خواہ کوئی وجہ بھی ہو ہر ایک کا منشا اور منبع بد اخلاقی اور خفت ہی ہے۔ علاوہ ازین معاشرتی مصلح کے حق میں ہدیہ دینا اتنا مفید نہیں جتنا اس کا واپس لینا ان کے حق میں مضر ہے۔ اس سے اس شخص کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ اسے اپنی نعمت ہتک تصور کرے گا اور اس تصور سے اس کا مشتعل ہو جانا بلکہ انتقام پر اتر آنا یقینی ہے۔ اسی اندیشہ اور خطرہ کی وجہ سے کسی شخص کے لیے۔ اگر اس کے کئی بیٹے ہوں۔ جائز نہیں کہ ایک لڑکے کو کوئی چیز عہدہ کرے اور دوسروں کو یونہی چھوڑ دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو گویا

سگے بھائیوں کو باہم دشمن بناتا ہے۔

**وصیت** اور وصیت کار وراج ہر ملک اور قوم میں رہا ہے۔ اہل اسلام کو بھی اسکی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن چند قانونی پابندیوں کے ساتھ۔

(۱) آدمی اپنے کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا۔ حدیث میں آتا ہے کہ لا وصیۃ لوارث (وارث کے لیے وصیت نہیں ہے) اور اس کے ساتھ ہی اس کی علت بھی بیان فرمادی گئی ہے ان اللہ علی لکل ذی حق حقدہ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار یعنی وارث کا حق خود ہی متعین کر دیا ہے)۔ اہل جاہلیت وصیت کے بارے میں بڑی ہی افراط و تفریط سے کام لیتے تھے۔ وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر حق اور مصلحت کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوڑ دیتے اور واقعی حقدار کو اس کے حق سے محروم کر کے دور کے لوگوں کے لیے سارا مال وصیت کر جاتے۔ اس کم بینی اور ناحق شناسی کا درعاذہ بند کرنا ضروری تھا۔ پھر اس کی جگہ ایک متوسط اور متوازن اور مصالح تمدن کے موافق متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ وصیت کا زیادہ حق ان متعلقین کو ٹھیرا یا جائے جو رجمی رشتہ رکھتے ہوں بقابلہ ان لوگوں کے جو محض عارضی اسباب کی وجہ سے قریب ہو گئے ہوں۔ لیکن جب قرآن نے میراث کے مفصل اور متعین احکام نازل فرمادیے اور ہر ایک وارث کا حصہ یہ کہہ کر متعین کر دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں ان میں کمی بیشی نہ ہونے پائے، اللہ نے میراث کی اس تقسیم میں معاشرت اور تمدن اور قرابت کے جن مصالح اور حکم کو رجمی رکھا ہے ان کی کنہ تک تمہاری نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ تو پھر کسی وارث کے حق میں وصیت کا کوئی موقع ہی نہیں رہا ورنہ خدا کی حدود ٹوٹ کر رہیں گی وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ نیز اس سے یہ بھی خطرہ ہے کہ وارثوں کے درمیان بغض اور عداوت کا ایک خوفناک جذبہ پیدا ہو جائے گا کیونکہ ہر وارث چاہتا ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ شریعت نے میراث کا قانون منضبط کر کے ان کی ان متصادم خواہشوں کے مفاسد کا سدباب کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے ایک خاص رشتہ دار کے حق میں وصیت کرتا ہے تو گویا دوسرے وارثوں کو اس کے خلاف نفرت اور بغض و حسد پر ابھارتا ہے۔

(۲) وارثوں کے لیے کم از کم دو تہائی مال چھوڑنا ضروری ہے۔ وصیت کرنے والے کو زیادہ سے زیادہ اپنے مال کا ایک تہائی حصہ وصیت کے ذریعے سے غیر وارث لوگوں کو دینے کا حق دیا گیا ہے۔ سعد بن ابی وقاص نے ایک مرتبہ بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ میں بہت بڑی دولت کا مالک ہوں، صرف ایک لڑکی ہے جس کے علاوہ اور کوئی میرا وارث نہیں تو میں کس قدر مال کی وصیت کر سکتا ہوں؟ کیا تمام مال کی یا نصف کی یا ثلث کی؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا: ایک تہائی کی وصیت کر لو اور وہ بہت ہے تمہارا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں اس حال میں چھوڑ دو کہ وہ لوگوں پر بار ہوں۔“

مال متروکہ کے اصل وارث اور مستحق تو مقرر اور واجباً اس کے قریبی رشتہ دار ہیں، اگر وہ دوسروں کے لیے اپنے مال کی وصیت کر جاتا ہے تو اقربا کی کتنی بڑی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خود حکمتِ تمدن کا مقتضی ہے کہ مرنے کے بعد وصیت کا ترک وہی لوگ پائیں جو دنیا میں اس کے سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ خیر سگال، سب سے زیادہ ہمدرد اور مددگار تھے۔ اور ان باتوں میں باپ بیٹے وغیرہ جیسے ذوی الارحام سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے چنانچہ اسی لیے قرآن میں آتا ہے: **وَأُولَ الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ** اور اللہ کی کتاب یعنی قانون میں رحمی رشتہ رکھنے والے ایک دوسرے کے زیادہ قریبی اور یگانہ ہیں۔ اس لحاظ سے تو تمام ترک و رد ہی کو ملنا چاہیے۔ مگر معلمِ حکمت کی نگاہ حقیقت میں وقتی اور خارجی مصالح کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ فرض کرو کسی کی تربیت میں کوئی تمیم بچہ ہے، یا کسی کے ایسے غریب رشتہ دار ہیں جنہیں رزروئے قانون و ارث نہیں پہنچتی۔ کیا وجہ ہے کہ ان کی مدد کا دروازہ بند کر دیا جائے؟ اسی طرح اگر کوئی دولت مند آدمی اپنے چھوڑے ہوئے مال میں سے ایک حصہ رفاہ عام کے کاموں میں صرف کرنا چاہتا ہو تو کیوں اس کو ایسے نیک کام سے روکا جائے؟ پس شریعت میں دونوں پہلوؤں کے درمیان پورا توازن قائم کیا گیا ہے۔ نہ جائز حق دار اپنے حق سے محروم کیے جاسکتے ہیں، اور نہ فضل و احسان ہی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

(۳) وصیت کرنے والے کو چاہیے کہ آخری وقت کا انتظار نہ کرے بلکہ وصیت لکھ کر محفوظ کر دے۔

حدیث میں مذکور ہے کہ وہ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایک رات اس حال میں گزار دے کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو اور وہ وصیت اس نکلے لکھ نہ وی ہو۔ اس حکم کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ صبح تک وہ اس دنیا میں نہ رہے اور جن مصالح اور مقاصد کے لیے اس نے وصیت کا ارادہ کیا ہے وہ فوت ہو جائیں۔

**وقف** | تبرعات ہی کی ایک قسم وقف بھی ہے۔ اب تک تعاون و تبرع کی جتنی صورتیں بیان ہو چکی ہیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی شکل میں قبل اسلام بھی رائج تھیں۔ لیکن وقف کا طریقہ بالکل نامعلوم تھا۔ یہ شائع اسلام علیہ السلام کا مخصوص اجتہاد ہے، جس کے اندر نظام معیشت و معاشرت کے ایسے مصالح پوشیدہ ہیں جو دیگر اقسام صدقات و تبرعات سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک شخص خواہ کتنا ہی بڑا خزانہ فقیر و مساکین کے

لہ ترجمان القرآن - اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے:

کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا أَنْ تُوَصِّيَهُ لِمَا بَيْنَ يَدَيْكُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَبِحَقِّهَا عَلَى الْمُتَّقِينَ

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور اس نے اپنے مال اور اقرار کے لیے اچھا خاصا مال چھوڑا ہو تو اس پر فرض کیا گیا کہ احسان کے طور پر اس مال میں سے کچھ وصیت کرے۔ یہ حق ہے پر ہیز گاروں پر۔

اس آیت میں خیر (یعنی اچھے خاصے مال) سے مراد اتنا زیادہ مال ہے جس میں سے تمام وارثوں کو کافی حصہ پہنچنے کے باوجود ایک معتدب

حصہ بچ سکتا ہو۔ مال کم ہونے کی صورت میں وصیت نہیں چھوڑنے کی ضرورت ہے کہ ایک متبہ اپنے ایک عزیز کی عیال کو تشریف لے گئے۔

انہوں نے پرچہ دیا کہ میں وصیت کروں؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان توراہ خیر کی شرط لگائی ہے۔ تم کچھ بہت مال تو رکھتے ہو؟

تھوڑا سا مال ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے چھوڑ دو۔ البتہ مال زیادہ ہونے کی صورت میں بعض کے نزدیک سبب اور بعض کے نزدیک واجب ہے کہ ایک حصہ

(جو ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو) کسی کار خیر میں صرف کرنے کے لیے وصیت کر دی جائے۔ اور آیت کے الفاظ ان لوگوں کے قول کی تائید

کرتے ہیں جو وصیت کو واجب قرار دیتے ہیں (کتب علیکم - اور حقا علی المتقین)۔ ابن عباس اور حسن بصری اور

بعض دوسرے اکابر صحابہ و تابعین و تابعین و تابعین ہی کے قائل ہیں۔

یہ صدقہ کر دے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک مدت مخصوص کے بعد وہ فروخت ہو جائیگا اور ان فقرا کے بعد جو حاجت مند ہونگے وہ اس صدقہ عامہ سے کوئی حصہ نہ پاسکیں گے۔ پس مقاصد کے کمال حصول اور رفاہِ خلق کی عمومیت کے لحاظ سے صدقہ کی اس شکل سے بہتر کوئی شکل نہیں ہو سکتی کہ کوئی مال یا جائداد غریب و مساکین اور دیگر حاجت مندوں کے حق میں اس طور پر بخش دی جائے کہ اصل ہمیشہ اپنی حالت پر باقی رہے، اس میں کچھ بھی خرچ نہ ہو اور محض اس کے منافع سے حاجت مندوں کی حاجت ردوائی ہوتی رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت نے ان الفاظ میں وقف کی اجازت مرحمت فرمائی تھی:

ان شئت حبست أصلها  
و تصدقت بها  
اگر تم چاہو تو اس (مال یا جائداد) کی اصل روک لو  
اور اس کا (یعنی اس کے منافع) کا صدقہ کرو۔

چنانچہ حضرت عمر نے بونہی کیا اور اس جائداد کو اس شرط پر وقف کر دیا کہ نہ تو وہ بھیجی جاسکے گی نہ حصہ کی جائے گی نہ اس میں میراث جاری ہوگی، بلکہ محض اس کے منافع فقیروں (حاجت مند) قرابت داروں، غلاموں، مسافروں اور یتیموں اور دیگر شرعی ضروریات پر خرچ کیے جائیں گے۔ اس کا متولی اگر حسب دستور اس کی آمدنی میں سے خود بھی کچھ اپنے لیے لے لیا کرے تو اس کے لیے جائز ہے۔

**السید الشیرازی**  
مولف مولوی ابوسعید عبدالرحمن صاحب فرید کوٹی۔ اس کتاب میں فاضل مولف نے بائبل سے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے لہو کی پچاس پیشگوئیاں جمع کی ہیں۔ ان میں کچھ نہایت صادیح ہیں اور کچھ محمل، جن میں آنے والے نبی کی محض علامات اور نشانیاں اور کچھ حالات بتائے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ ان کا مصداق ذاتِ پاک مصطفوی کے علاوہ اور کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب عیسائیوں میں پھیلا کے لیے نہایت مفید ہے اور مبلغین اسلام کو بھی اس سے بے نیاز نہ رہنا چاہیے۔ نیز جن لوگوں کو عیسائیوں کے گفتگو کا موقع ملتا ہے ان کے پاس اس کتاب کا رہنا بے حد ضروری ہے۔ قیمت ۶/۔

ملنے کا پتہ دفتر ترجمان القرآن۔ ملتان روڈ۔ لاہور